اقبال کا تصور ختم نبوت

پروفیسر عبدالقیوم

اقبال کے نزدیک وحی ایک ایسا خاصہ حیات ہے جو نہ صرف انسان سے مخصوص ہے بلکہ حیوانات اور نباتات میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اس خاصے ہی کی کارفرمائی ہے کہ پودا زمین کی پہنائیوں میں سے آزادانہ سر نکالتا ہے' حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کوئی نیا عضو نشو ونما پاتا ہے' اور انسان خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نور اور روشنی حاصل کرتا ہے (۱)۔ اس نظریے کی جیسا کہ وہ خود بھی کہتے ہیں' قرآن حکیم سے بجا طور پر تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت بخشی اور اسے ہدایت دی" (۲۰-۵)۔ سورۃ النحل میں ہے کہ "تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کر دی کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور چھتریوں میں' جو لوگ بناتے ہیں' گھر بناؤ (۱۶-۶۸)۔ اس طرح وحی ایک ایسا شعور حیات ہے جس کی روشنی میں ہر ذی حیات سرگرم عمل ہے۔ یہ شعور اس کی جبلت اور طینت میں خمیر کر دیا گیا ہے۔ اس کی بدولت اسے علم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا' وہ مقاصد کیا ہیں جن کے حصول کے لیے اسے جدوجہد کرنا ہے اور وہ وسائل و ذرائع کیا ہیں جن کے استعمال سے ان مقاصد کا حصول ممکن ہے۔ حشرات الارض اور حیوانات کے افعال ان کی جبلتوں کے تابع ہوتے ہیں جن کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ شعور سے خالی ہوتے ہیں' لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ ان افعال کے سائنسی مطالعے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جبلی افعال میں بھی شعور کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی جبلی فعل کے تصور کے بعد یہ فعل بذات خود اتنی جلدی واقع ہو جاتا ہے کہ تصور فعل اور فعل کے درمیان کوئی وقفہ نہیں رہتا۔ شعور کا انحصار اس وقفے پر ہے جو تصور اور فعل کے درمیان ہوتا ہے۔ جبلی کردار خواہ کتنا ہی لاشعوری کیوں نہ ہو' وقوفی عنصر کا حامل ہوتا ہے۔ جو

وقوف جبلی افعال سے وابستہ ہوتا ہے' وہ شعور باطن میں منعکس ہونے کے بجائے خارجی حرکات میں ظاہر ہوتا ہے۔ جبلت سے وابستہ شعور مضمن ہوتا ہے نہ کہ واضح۔ اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات کے جبلی افعال کا ارتکاب جس صحت اور نظم سے ہوتا ہے' اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ حیوان اپنے افعال کا ارتکاب ایسے کرتا ہے جیسے اس ارتکاب کے دوران تمام حرکات و سکنات اور ان کے نتائج کا شعور اس کو اس طرح ہو جیسا کہ انسان کو اپنے شعوری افعال کی منصوبہ بندی اور ان کے واقعی ارتکاب کے وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کا وہ شعور جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کا نصب العین متعین کرتا ہے اور اس کے حصول کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل تجویز کرتا ہے' اگرچہ تعقل و استدلال سے یا تجربے سے حاصل ہو سکتا ہے' لیکن جب ایسے شعور کی کیفیت وجدانی ہو تو وہ حیوانات کے شعور سے' نوعیت کے لحاظ سے' مختلف نہیں ہوتا۔ یہ خفی شعور جو حیوانات میں ان کے افعال کے ساتھ غیرواضح شکل میں وابستہ ہوتا ہے' اور وہ شعور جو انسان کو وجدان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے' اقبال کی نظر میں وحی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے وجدانی شعور کے سرچشمے کی نوعیت کیا ہے۔ اس سوال کا ایک سیدھا سادہ جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح حیوان میں اس کا شعور اس کی جبلت کا ایک حصہ ہے' اسی طرح انسان کا وجدانی شعور اس کی جبلت اور فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن یہ جواب اسی مسلمہ نظریے کا نقیض ہے کہ وحی انسان کو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم بالوحی کا ماخذ خارجی ہے۔ یعنی نہ تو یہ اس کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے اور نہ اس کا خود پیدا کردہ ہے۔ اس کا منبع کوئی مافوق الفطرت ذات ہے۔ اس تضاد کو اس امر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اقبال نبوت کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ

> "یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سر نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔" (۲)۔

ظاہر ہے کہ یہاں اقبال علم بالوحی کا منبع انسان کی اپنی ذات کو سمجھتے ہیں نہ کہ کسی خارجی ذات کو۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ infinite (لامتناہی) کے لفظ

کو بڑی I سے نہیں لکھتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس لاقتاہی سے ان کی مراد کوئی خارجی قوت یا خدا تھی۔ اقبال اس تضاد کو یہ کہہ کر رفع کر سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کائنات فطرت کی ہر شے وحی سے متصف ہے اور انسانی اور حیوانی مخلوق اس فطرت کا ایک حصہ ہے جو خدا کی بنائی ہوئی ہے' تو حیوان کا جبلی شعور اور انسان کا وجدانی شعور' دونوں خدا کی بنائی ہوئی فطرت کا تقاضا ہونے کے باعث خدا کے عطا کردہ ہیں۔ اس طرح سے ہم جائز طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ضمن میں علم بالوحی کا منبداء خدا ہے۔ اس پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ جس طرح ہم اس شعور کو جسے اقبال وحی کہتے ہیں' حیوانات کے ضمن میں' خدا کا نام بیچ میں لائے بغیر' فطرتی اصطلاح میں بیان کرتے ہیں' اسی طرح کیا یہ زیادہ مناسب نہ ہو گا کہ علم بالوحی کو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے اعتبار سے' خدا سے منسوب کرنے اور اسے خدا کی طرف سے نازل سمجھنے کے بجائے' ہم یہ کہیں کہ انسان کا علم بالوحی بھی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ البتہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے' وہ شاید 'وحی متلو' کے بارے میں نہ کہا جا سکے۔ اس کے علاوہ اگر ہم خدا کو عالمگیر وحی کا مبداء اس لیے گردانتے ہیں کہ حیوان کی جبلت اور انسان کا وجدان خدا کی بنائی فطرت کے تقاضے ہیں تو کیا ہم اس طرح یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ انسان کی قوت تعقل اور استعداد مشاہدہ بھی خدا کے عطیے ہیں۔ اس لیے جس طرح وحی کا مبداء خدا ہے' اسی طرح عقل و مشاہدہ سے حاصل کیا ہوا علم بھی خدا کا دیا ہوا ہے' اور دونوں' مصدر و منبع کے لحاظ سے ہم رتبہ ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ جوں جوں حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہے' وحی کی ماہیت و نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے۔ اقبال نے جن معنوں میں لفظ وحی کو استعمال کیا ہے' اس کی رو سے یہ ایک خاصہ ہے جو نوع کے سب افراد میں پایا جاتا ہے' خواہ وہ نوع انسانی ہو یا حیوانی' جیسا کہ حیوانات میں جبلت (Instinct) نوع حیوانی کے ہر فرد میں ہے۔ جب انسانی زندگی جبلی حالت میں تھی تو یہ خاصہ بھی کم و بیش اسی طرح نوع انسانی کے ہر فرد میں موجود تھا۔ لیکن انسان نے جب ارتقائی منازل طے کیں اور اس کی زندگی جبلی حالت سے' جس میں بقول ہابز (Hobbes) یہ خود غرضانہ اور بہیمانہ خصوصیات سے متصف تھی' اس حالت میں آئی جہاں باہمی تعاون و اشتراک؛

خود ایثاری و ہمدردی جیسے جذبات نے نشو و نما پائی اور ایک اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا تو اس وقت وحی کی شکل مختلف ہو گئی۔ تب یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی تھی بلکہ نوع انسانی کے چیدہ چیدہ افراد کو دی گئی' اور یہ ان افراد کا فریضہ تھا کہ وہ اسے اپنی نوع کے دوسرے افراد تک پہنچائیں۔ وحی کی یہ شکل انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تھی یا یوں کہیے کہ جہاں تک خالص طبعی زندگی کا تعلق تھا جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور جو جبلت کے تابع ہے' یعنی کھانا' پینا' سونا' جاگنا اور جنسی خواہش' اس زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جیسے شعور کی ضرورت تھی' وہ تو نوع کے ہر فرد کو ارزانی کیا گیا' لیکن وہ علم جس کی روشنی میں حیات اجتماعیہ متشکل اور منظم ہوتی تھی' وہ ہر فرد کے بس کی بات نہیں تھی' وہ صرف ان چند افراد کا مقدر تھا جو باقی افراد کی نسبت کہیں زیادہ ذہن رسا کے مالک' بلند بیں اور حساس ہونے اور کہیں زیادہ پختہ عزم اور اعلیٰ استعداد عمل رکھنے کے باعث نہ صرف ان قوانین و ہدایات اور ضوابط و قواعد سے باخبر تھے جن پر عمل کر کے افراد نہ صرف اجتماعی بقائے دوام اور تحفظ و امن اور انفرادی فلاح و بہبود اور سربلندی و کامرانی حاصل کر سکتے تھے' بلکہ وہ خود ان پر عمل کرنے اور دوسرے افراد کو اپنے دائرۂ عمل میں داخل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے' یہ تمام علم ان کو باطنی واردات پر مبنی وجدانات کی صورت میں ملتا تھا۔ اس باطنی مشاہدے میں انہیں یہ یقین محکم بھی ملتا تھا کہ ان کا یہ علم خود اکتسابی نہیں بلکہ یہ انہیں ذات مطلق کے فیضان سے ملا ہے۔ یہ چیدہ چیدہ افراد انبیاء کہلائے' اور وحی جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے' انہی اشخاص سے مخصوص ہے۔ اس وحی کی ضرورت' اقبال کہتے ہیں' بنی نوع انسان کے عالم صغر سنی میں تھی۔ ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نبی کا حکم ہو اور اس کی اطاعت ہو۔ افراد خود کسی چیز پر حکم نہیں لگاتے تھے' نہ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ ان کی پسند کیا ہے اور ناپسند کیا ہے۔ انہیں یہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے لیے کیا راہ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں پہلے ہی سے طے شدہ تھیں' یہ نہیں کہ انہیں اس بارے میں اپنی فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے۔ دوسرے الفاظ میں اوامر و نواہی کا ایک طے شدہ ضابطہ سامنے تھا جس کو نافذ کرنے کے لیے نبی کا حکم اور اس نبی کو ماننے والوں کی اس حکم کی بلاچون و چرا اطاعت تھی۔ ان اوامر و نواہی کی حکمت و اہمیت اور ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی بحث و تمحیص نہ تھی۔ اسی بنا پر شعور نبوت کو اقبال کفایت فکر و انتخاب سے تعبیر کرتے

ہیں کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہر فرد کو اوامر و نواہی کے بارے میں نہ کچھ سوچنے کی ضرورت تھی اور نہ کچھ فیصلہ کرنے کی۔ یہ کام نبی کو کرنا تھا' افراد کا کام صرف اطاعت تھا۔

انسان جب ان ابتدائی مراحل سے گزر کر آگے بڑھا اور اس کی تنقیدی فکر نشو ونما پانے لگی اور اس میں وہ شعور پیدا ہونے لگا جو اس کی عقل استقرائی کا مرہون منت ہے' اور جو صرف چند خاص افراد کو عنایت نہیں ہوا تھا بلکہ ہر شخص کی دسترس میں تھا اور انسانی زندگی ارتقاء کی اس سطح پر پہنچ گئی جہاں اب کفایت فکر و انتخاب کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی اوائل میں تھی' جبکہ افراد پر ایما اور اشارے کا غلبہ تھا' تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں تھا کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں یعنی (وحی و الہام) سے ہوا' ان کا ظہور اور نشوو نما رک جائے (۳) یعنی سلسلہ نبوت بند ہو جائے۔ چنانچہ اسلام میں یہ عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ چونکہ وہ وحی جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی' مکمل تھی' اس لیے مزید کسی وحی کی ضرورت نہیں۔ وہ خاتم الانبیاء اور نبی آخرالزماں تھے۔ اس عقیدے کی حکمت بیان کرتے ہوئے' اقبال کہتے ہیں کہ "آپؐ کی بدولت زندگی پر علم و حکمت کے وہ نئے سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔" یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظر میں عقل استقرائی کا ظہور اسلام کے ظہور کے ساتھ ہوا۔ پھر اس مرکزی نقطے کو بیان کرتے ہیں کہ اسلام میں نبوت اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو جان لینے میں اپنے معراج کمال کو پہنچی ہے(۴) جس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان پوری خود شعوری کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وسائل سے کام لے(۵)۔ اقبال کے خیال میں اسلام کا دینی پیشوائی کو تسلیم نہ کرنا' قرآن حکیم کا عقل اور تجربے پر بار بار زور دینا' اور کائنات' فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرانا' یہ سب تصور خاتمیت کے مختلف پہلو ہیں(۶)۔ آگے چل کر اقبال کہتے ہیں کہ ختم نبوت کا مطلب باطنی واردات کا خاتمہ نہیں۔ تصور خاتمیت کی اہمیت یہ ہے کہ اس یقین کو فروغ دے کر کہ انسانی تاریخ میں ہر اس شخصی اختیار کا خاتمہ ہو گیا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ مافوق الفطرت ہے' باطنی واردات کی طرف آزادانہ تنقیدی رویہ پیدا کرتا ہے(۷)۔ اسلامی کلمے کے جزو اول نے قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رکھ کر انسان کے اندر مظاہر فطرت کا تنقیدی مشاہدہ کرنے کی روح کو نہ صرف جنم دیا بلکہ اس کو ترقی بھی دی(۸) اور کائنات فطرت کا مطالعہ خالص سائنسی انداز میں ہونے لگا۔ اقبال کی

نظر میں عقیدہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ "اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے' لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے" (۹)۔ اقبال نے ختم نبوت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے' ان سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب' جبکہ انسانی زندگی ارتقاء کی اس سطح پر پہنچ چکی ہے جہاں انسان اپنی عقل اور مشاہدے سے حاصل شدہ علم اور شعور کی روشنی میں اپنی زندگی کا نصب العین متعین کر سکتا ہے اور اس کے حصول کے لیے اپنی ہی عقل اور مشاہدے کو بروئے کار لا کر رہنما اصول بھی وضع کر سکتا ہے' اب اسے اپنے سے بیرون کسی مافوق الفطرت ہستی کا دست نگر نہیں ہونا پڑے گا۔ اب اسے ایسا علم قبول کرنے اور اس علم کے دیے ضابطوں اور قاعدوں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں جس کا سرچشمہ مافوق الفطرت ہو۔ دوسرے الفاظ میں اب انسانی زندگی کی ہدایت کے لیے وحی کی جگہ انسانی عقل و مشاہدے نے لے لی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اقبال کے اور عام مسلمان کے اس عقیدے سے صرف نظر کر کے کہ مسلمان کی زندگی جز قرآن کچھ نہیں' خالی الذہن ہو کر اقبال کے تصور ختم نبوت کا جیسا کہ انہوں نے اسے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں بیان کیا ہے' مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اقبال کے خیال میں ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ عہد جدید میں انسان کی ہدایت کے لیے وحی کی جگہ اس کی عقل نے لے لی ہے تو وہ شخص ایسا کرنے کا مجاز ہو گا۔ جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ زندگی کو یہ انکشاف کہ اس کے نئے رخ کے لیے وحی سے مختلف دوسرے ذرائع علم موزوں ہیں' رسول اکرمؐ کی بدولت ہوا' اور یہ کہ اسلام کا ظہور عقل استقرائی کا ظہور ہے تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ اب زندگی کے تقاضے نئے ہیں' اور کچھ ایسے ہیں کہ ان کو پورا کرنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے' وہ وحی کا علم نہیں' بلکہ انسان کی عقل استقرائی سے حاصل کیا ہوا علم ہے۔ اقبال کا نظریہ حقیقت یہ ہے کہ "حقیقت مطلقہ ایک بابصر اور خلاق مشیت ہے(۱۰)۔ حقیقت کا اظہار مسلسل خلاقی میں ہوتا ہے۔ اس کائنات میں حرکت اور روانی ہے۔ زندگی جوں جوں آگے بڑھتی ہے' نئے روپ اور نئے رخ اختیار کرتی جاتی ہے اور اس کی ضروریات اور تقاضے بھی نئے ہوتے جاتے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وسائل و ذرائع بھی نئے ہوں گے۔ اور اگر جیسا کہ اقبال خود کہتے ہیں "وحی کی ماہیت اور نوعیت بھی' جوں جوں

زندگی ارتقاء اور نشو ونما حاصل کرتی ہے' بدلتی رہتی ہے" تو اگر زندگی کے ارتقاء کے کسی مرحلے پر کفایت فکر اور انتخاب کی ضرورت تھی تو زندگی جب دور جدید میں داخل ہوتی ہے' یہ ایک ایسی ہیئت اختیار کرتی ہے کہ اس کو ارتقائی منازل کامیابی سے طے کرنے کے لیے علم بالوحی کے بجائے سائنسی علم درکار ہو گا۔ اگر انسان کے عالم صغر سنی میں اس کے لیے وحی کا علم موزوں تھا تو اس کے سن بلوغ میں اس کے لیے سائنسی علم مناسب ہو گا۔ اور پھر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی نہیں بسر کر سکتا اور اب حصول علم کے لیے اپنے ہی وسائل سے کام لینا ہو گا تو اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ حصول علم کے لیے انسان کو اپنی ذات کے سوا کسی اور ذات کا محتاج نہیں ہونا۔ یعنی اب وہ وحی کا محتاج نہیں رہا۔ پھر اگر وحی کی روشنی میں زندگی گزارنی ہے تو اسلام نے' بقول ان کے' دینی پیشوائی کو کیوں نہیں تسلیم کیا' وحی کے تحفظ اور اس کی ترویج کا کام تو دینی پیشوا ہی کرتے ہیں۔ آخر میں جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ "اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو عقیدۃً بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے' لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم ہے' تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وحی جس کے علم کا تعلق بھی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے' مستحق اتباع نہیں رہی اور اس کی جگہ عقل نے لے لی ہے؟

ظاہر ہے کہ اقبال نے ختم نبوت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے' ان کی مذکورہ بالا تعبیر جس کا لب لباب یہ ہے کہ دور جدید میں انسان کی ہدایت کے لیے وحی کی جگہ عقل نے لے لی ہے' ان کے لیے بالکل قابل قبول نہیں ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے خطبات تیار کر رہے تھے تو انہیں اس بات کا قطعاً اندازہ نہیں ہو گا کہ ان کے خیالات کی یہ تعبیر بھی ہو سکے گی۔ سات سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں جب لاہور کے ایک ہفت روزہ "لائٹ" کے مدیر نے یہ لکھا کہ اقبال عقل کو نبوت پر ترجیح دیتے ہیں تو ان کا اس ضمن میں ایک وضاحتی بیان "طلوع اسلام" میں شائع ہوا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں اس تعبیر کی تردید کی' چنانچہ اس بیان میں وہ کہتے ہیں کہ "لیڈنگ سٹرنگس (Strings) سے مراد لیڈنگ سٹرنگس آف ریلیجن (Leading strings of Religion) نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگس آف فیوچر پرافٹس آف اسلام (Leading strings of future prophets of Islam) ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور الہام اور وحی کی غلامی حرام ہے۔

بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے۔ اور لطف یہ ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی' غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ آپؐ کی نبوت کے احکام دین فطرت ہیں' یعنی فطرت صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے ہیں' اس واسطے عین دین فطرت ہیں' ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں(۱)۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ " میرے عقیدے کی رو سے بعد وحی محمدیؐ کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ تو الہام کا جاری ہے' مگر الہام بعد وحی محمدیؐ حجت نہیں' سوائے اس شخص کے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر بعد وحی محمدیؐ الہام ایک پرائیویٹ fact ہے۔ اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں۔ میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ نبوت کی دوسری حیثیت ایک Socio-Political Institution کی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بعد وحی محمدیؐ کسی کا الہام یا وحی اسے Institution کی بنا قرار نہیں دے سکتا"(۲)۔ مناسب ہو گا کہ اس توضیحی بیان پر کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ Leading Strings کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے ان کی مراد Leading strings of religion نہیں بلکہ Leading strings of future prophets of Islam ہے۔ اس وضاحت کے بعد پورا جملہ یہ ہو گا:

Life can not for ever be kept in leading strings, not of religion, but of the future prophets of Islam.

میرے خیال میں اس جملے کے کوئی مربوط معنی نہیں نکلتے۔ ہم کسی ایسی چیز کے بارے میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بطور سہارا کام نہیں دے گی جو زمانہ حال میں بطور سہارا کام دے رہی ہے' لیکن کسی مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والی شے کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمیشہ بطور سہارا کام نہیں دے گی۔ علاوہ ازیں Future prophets of Islam کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں میں تو کوئی شخص نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا' دوسری غیر مسلم اقوام میں نبوت کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ الہام کا سلسلہ جاری رہے گا' لیکن یہ الہام Socio-political institutions کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ لیکن ساتویں خطبے میں وہ مذہب کے تین ادوار' 'ایمان'

'فکر' اور 'معرفت' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیسرے دور میں انسان کو یہ آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتحاد و اتصال قائم کرے' اس کی یہ آرزو تب پوری ہوتی ہے جب وہ باطنی تجربے کے مختلف مراحل طے کر کے اس آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ کچھ دیکھے' بلکہ یہ کہ وہ کچھ بن جائے۔ "اس کا آخری عمل فکر کا عمل نہیں' وہ ایک حیاتی عمل ہے جو اس میں گہرائی اور پختگی پیدا کرتا ہے اور اس کے ارادوں کو تقویت دیتے ہوئے ایک شان خلاقی کے ساتھ اس تیقن کا باعث ہوتا ہے کہ دنیا محض دیکھنے یا افکار و تصورات کی شکل میں سمجھنے کی چیز نہیں بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کو مسلسل عمل سے بنایا جاتا ہے' اور بار بار بنایا جاتا ہے" (۱۳)۔ اس باطنی تجربے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایسا انسان ابھرتا ہے جو تعمیر و ترقی حیات کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس باطنی تجربے کو mysticism کہنے سے گریز کرتے ہیں جس سے مراد وہ ذہنی روش ہے جس سے زندگی کی نفی اور چشم پوشی ہوتی ہے' اور جو ہمارے دور میں استعماری رجحان کے خلاف ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے ارادے کو پختہ کرنے اور اس میں استعداد عمل پیدا کرنے میں حقیقت مطلقہ یعنی خدا کو کوئی دخل ہے کہ نہیں جس کے ساتھ وہ اتحاد و اتصال قائم کرتا ہے' اور پھر دنیا کو بنانے' اور بار بار بنانے کے لیے اسے ہدایات اور راہنما اصول کہاں سے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا مصدر و منبع بھی اس اتحاد و اتصال کے باعث خدا ہو گا۔ مزید برآں دنیا کو بنانے' اور بار بار بنانے کی ٹھوس شکل یہ نہیں کہ Socio-political institution قائم کیا جائے اور اسے مسلسل جدوجہد سے ترقی و فروغ دیا جائے۔ یہ باطنی تجربہ اس طرح سوشل مفہوم اختیار کر جاتا ہے۔ جس الہام کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ جاری رہے گا' اس کی نوعیت کیا وہی نہیں جو ان صوفیانہ واردات کی ہے جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ختم نبوت کے بعد جاری رہیں گی' اور جن پر آزادانہ تنقید سے علم کے نئے نئے راستے کھلتے ہیں۔ یہ علم معاشرتی علم بھی ہو سکتا ہے جو Social اہمیت کا حامل ہے۔ ایک طرف الہام کا کوئی سوشل مفہوم نہیں' اور دوسری طرف باطنی واردات ہیں جن کا سوشل مفہوم ہے' اور پھر تیسرے' باطنی تجربہ ہے۔ میرے خیال میں یہ تینوں صوفیانہ واردات ہیں' اور ان تینوں کی نوعیت ایک ہے۔ اور ساتویں خطبے میں جس باطنی تجربے کا ذکر کرتے ہیں اور جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے' شعور نبوت سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ اس مماثلت کو اقبال کے اس نظریے سے

تقویت ملتی ہے کہ واردات باطن باعتبار نوعیت انبیاء کے احوال و حوادث سے مختلف نہیں۔

اقبال نے جو توضیحات ختم نبوت کے اپنے تصور کے صحیح مفہوم کو متعارف کرانے کے لیے کی ہیں' اگر ہم ان کو سامنے رکھیں اور ساتھ ہی ان تصریحات پر نظر ڈالیں جو انہوں نے نظریہ ختم نبوت کی حکمت اور اس کی ثقافتی اہمیت ذہن نشین کرانے کے لیے پیش کی ہیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ وحی محمدیؐ کے بعد کسی اور وحی و الہام کی نفی تو وہ کمال فلسفیانہ استدلال سے کرتے ہیں' اور ایک کھلا ذہن اسے قبول کرنے پر مجبور ہو گا' لیکن جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ وحی محمدیؐ نہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انسانوں کے لیے حجت تھی بلکہ بعد میں بھی' ہمیشہ کے لیے' حجت رہے گی خواہ انسانی عقل کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے' وہ اس دعوے کے حق میں کوئی ٹھوس اور منطقی دلائل پیش نہیں کر سکے۔ اس ضمن میں محض ادعا ہے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ جو قانون رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے ملا' مکمل اور ابدی ہے' لیکن کیسے اور کیوں مکمل اور ابدی ہے' وہ اس پر قطعاً بحث نہیں کرتے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام دین فطرت ہیں کیونکہ فطرت صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے ہیں' اس لیے عین دین فطرت ہیں' لیکن وہ ان سوالات کو زیر بحث نہیں لاتے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے کیسے پیدا ہوتے ہیں' دین فطرت سے کیا مراد ہے' فطرت صحیحہ کا کیا مفہوم ہے' فطرت صحیحہ انہیں کیسے اور کیوں قبول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ ہی عقل استقرائی کا ظہور' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت زندگی پر وحی کے علاوہ انسانی علم کے دوسرے سرچشموں کا انکشاف' اور پھر اس شخصی اختیار کا خاتمہ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کا سرچشمہ مافوق الفطرت ہے' ان سب کے ہوتے ہوئے وحی محمدیؐ کو ماننے اور اس سے حاصل کی ہوئی ہدایت پر عمل کرنے کا کیا جواز ہے۔ میرے خیال میں اگرچہ اقبال کے نظریہ ختم نبوت کی مذکورہ بالا تعبیر جائز ہے' لیکن اگر اس کی کوئی دوسری ایسی تعبیر ہو سکے جو اقبال کے اور عام مسلمان کے اس عقیدے سے نہ ٹکرائے کہ ان کی زندگی کو وحی محمدیؐ سے ہدایت پانی ہے تو صرف مذکورہ بالا تعبیر پر زور دینا اور کسی دوسری تعبیر کے لیے سعی نہ کرنا نہ صرف اقبال کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو گی بلکہ ایک بڑی ذہنی بد دیانتی ہو گی۔

اب میں ایک دوسری تعبیر پیش کرنے کی کوشش کروں گا جو مذکورہ بالا سوالات کے جواب

دینے کی سعی پر مشتمل ہو گی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں یہ سعی کروں' ایک اور وضاحت کا' جو اقبال نے ختمِ نبوت کے مسئلے کے ضمن میں کی ہے' ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اقبال کہتے ہیں کہ "نبوت کے دو اجزا ہیں (۱) خاص حالات اور واردات (۲) ایک معاشرتی سیاسی ادارہ (socio-political institution) قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔ یہ دونوں اجزا ہوں تو نبوت ہے۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزائے نبوت موجود ہیں' یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے"(۱۳)۔ یہاں خاص حالات اور واردات سے مراد وہ باطنی واردات ہیں جن کے ذریعے وہ علم حاصل ہوتا ہے جسے وحی کا علم کہتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کا جو علم ملا' وہ قرآن حکیم ہے۔ معاشرتی سیاسی ادارے کے قیام سے مراد وہ نظام ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم پر خود اپنے عمل اور اپنے پیروؤں کے عمل سے پیدا کیا۔ اس نظام کی واضح اور ٹھوس شکل حکومت الہیہ کا قیام اس زمین پر تھا جس کے سربراہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت کے جن اجزا کا اقبال نے ذکر کیا ہے' وہ یہ ہیں (۱) علمی جزو (۲) عملی جزو۔ علمی جزو کو جیسا کہ اقبال خود کہتے ہیں' ہم ولایت کا نام دے سکتے ہیں' اور عملی جزو کو قیام خلافت کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسے وحی ہوتی ہے' اور یہ سعی کرے کہ لوگ اس کی وحی کو صادق مان کر اس کے حلقہ اطاعت میں داخل ہو جائیں تو ایسا شخص کاذب ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس علم پر جو اسے قرآن سے ملا ہے' عمل کرکے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس پر عمل کرا کر ایک معاشرتی سیاسی ادارہ منظم کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں خلافت قائم کرتا ہے تو ایسا شخص کیونکر کاذب ہو سکتا ہے؟ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ جہاں تک ان کی ولایت کا تعلق ہے' یعنی وحی کے اس علم کا جو قرآن میں موجود ہے' وہ تو مکمل ہو گئی' اور اب ایسی ولایت کے ظہور کا نہ کوئی امکان ہے نہ جواز' لیکن جہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ خلافت کا تعلق ہے' تو یہ قیام خلافت خود ایک ایسا مقصد ہے جو نہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ان کے اور ان کے پیروؤں کے پیش نظر تھا اور جس کے حصول کے لیے وہ کوشاں رہے' بلکہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہمیشہ کے لیے ہر اس شخص کے

پیش نظر رہے گا جس نے یہ مان لیا کہ یہ خلافت اس علم کو جو قرآن میں موجود ہے' قبول کرنے اور اس علم کو عمل میں منتقل کرنے سے قائم ہو سکتی ہے یا یوں کہیے کہ باب نبوت تو بند ہو گیا لیکن باب خلافت ہمیشہ کھلا رہے گا۔ میں اس بات کی ذرا مزید وضاحت کر دوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ضمن میں ان کی دوگونہ حیثیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ ایک طرف تو پیغمبر خدا تھے' یعنی وہ خدا سے ایک قانون لائے جس پر چل کر ان کے پیروؤں نے ایک نظام' ایک جماعت' ایک خلافت قائم کی' تو دوسری طرف وہ ان لوگوں کے' جنہوں نے اس قانون خدا کو تسلیم کر لیا تھا اور اس پر سرگرم عمل تھے' زندہ امیر تھے اور ان سے قانون خدا پر عمل کراتے تھے۔ ان کی یہ زندہ امیر کی حیثیت ان کے سربراہ حکومت الہیہ ہونے کے باعث تھی۔ اطاعت رسول کا مطلب نہ صرف خدائی احکام کی تعمیل تھا' بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سربراہ حکومت اور سربراہ مومنین ہونے کے باعث زندہ امیر کی حیثیت سے دیے ہوئے' وقتی' زبانی' مصلحتی اور ہنگامی احکام کی تعمیل بھی تھا۔ اب جبکہ نبوت پر مہر لگ چکی ہے اور رسولوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب رسولوں کے بعد' نوع انسانی میں قیام جماعت کس طرح ہو' حکومت الہیہ کیسے قائم ہو' خلافت کا قیام کیسے ہو' معاشرتی سیاسی ادارہ جس کو اقبال نے جزو نبوت ٹھہرایا ہے' کس طرح عملاً' اور واقعی قائم ہو۔ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے:

> "محمدؐ تو صرف ہمارا ایک پیغام لانے والے ہیں۔ ان سے پہلے کئی پیغام لانے والے گزر چکے۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم پھر الٹے پاؤں اپنی پہلی بد نظمی کی حالت میں لوٹ جاؤ گے؟" (۳-۱۴۴)

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام دیا' جو جماعت منظم کی' اور جو خلافت قائم کی' اس کو قائم رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس سوال کا یہی جواب ہو گا کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت میں اپنے پیروؤں کے زندہ امیر تھے' اسی طرح بعد میں بھی ایک زندہ امیر ہر وقت موجود ہو جس کی اطاعت اسی طرح ہو جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی' بحیثیت ایک زندہ امیر کے' ہوتی تھی کیونکہ اس اطاعت کے بغیر نہ کوئی نظام واقعی پیدا ہو سکتا ہے' نہ کوئی جماعت منظم ہو سکتی ہے' نہ کوئی خلافت ہی قائم ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا

امیر خلیفۃ النبی کہلاتا ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین ہوتا ہے۔ اسی طرح ختم نبوت کے معنی یہ ہوں گے کہ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا' اس لیے کہ انسان کو اپنی زندگی' انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح' گزارنے کے لیے جس علم کی ضرورت تھی' وہ قرآن میں محفوظ ہے۔ لیکن جہاں تک قیام خلافت یا اقبال کے الفاظ میں معاشرتی سیاسی ادارے کے قیام کا تعلق ہے' تو یہ کام ہمیشہ جاری رہے گا۔

اب میں اس تعبیر کی طرف آتا ہوں جس کا میں نے اوپر اشارہ کیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ بہ اعتبار سرچشمہ وحی کے آپؐ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے' لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے آپ کا تعلق دنیائے جدید سے ہے(۱۵)۔ یہ جملہ میرے نزدیک بہت پر معنی ہے۔ یہ ایسے مضمرات کا حامل ہے کہ ان کو کھول کر بیان کر دینے سے ختم نبوت کا ایک ایسا تصور سامنے آئے گا جس کو شاید آپ اقبال سے آگے کچھ فکری پیش قدمی کہہ سکیں۔ وحی محمدیؐ کی روح کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ اس کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے اور تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جو اس روح کی بدولت ظہور میں آئی۔ اقبال کی نظر میں یہ اسی روح کا اثر تھا کہ مسلمانوں کو کائنات فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور و فکر کی ترغیب ہوئی۔ یہ قرآن کی تجربیت پسندی تھی جس کے باعث مسلمانوں نے علوم جدیدہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی روح ایسی تھی کہ اس کی بدولت مسلمانوں نے عقل استقرائی کو استعمال کر کے علم و حکمت کے نئے سرچشموں کو منکشف کیا' لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وحی کی روح کے لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق زمانہ جدید سے ہے تو اس کا ایک اور مطلب بھی ہو سکتا ہے' وہ یہ کہ رسول اکرمؐ کا پیغام خود ایک سائنسی پیغام ہے۔ یہی نہیں کہ اس کی بدولت اس کے ماننے والوں میں علوم طبیعی کے حصول کا شوق پیدا ہوا بلکہ یہ وحی خود بھی ایک ایسا ہی علم ہے جیسے دوسرے علوم۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا سائنسی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ پیغام ان قوانین و احکام اور ان قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے جن کی نوعیت و ماہیت بھی ویسی ہی ہے جیسی ان قوانین کی جو کائنات فطرت سے متعلق ہیں' یعنی قرآن حکیم کے دیے ہوئے قوانین خداوندی ایسے ہی سائنسی ہیں جیسے قوانین فطرت یا یوں کہیے کہ وحی محمدیؐ کے دیے ہوئے قوانین کا تعلق بھی عالم

فطرت سے ہے جس کا انسانی حیات بھی ایک حصہ ہے' اور یہ قوانین بھی عالم فطرت کے قوانین کی طرح عالمگیر' لازمی اور ابدی ہیں۔ اسلام ایک سائنسی ضابطہ حیات ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی سائنسی ماہیت کو واضح کرنے کے لیے قرآن حکیم کی اس آیت کا ذکر کرنا نہایت اہم ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے: "دین (حق) کی طرف رخ رکھو' اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں' یہی ہے سیدھا دین۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کا بھی) علم نہیں رکھتے" (۳۰-۳۰)۔ اس آیت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں :-

۱۔ دین اسلام اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس میں کوئی رد و بدل نہیں۔

۲۔ اللہ نے اسی فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے۔

دین اسلام کو اللہ کی بنائی فطرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی یہ فطرت بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ خارجی کائنات فطرت' اور اس کو بھی اللہ ہی نے تخلیق کیا ہے۔ اس مماثلت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات فطرت میں جاری و ساری قوانین کی اور اسلام کے قوانین کی ماہیت اور نوعیت ایک جیسی ہے۔ قوانین فطرت کے اہم خصائص کا تعلق ٹھوس اور محسوس اشیاء سے ہے' ان واقعات اور حوادث سے ہے جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دوسرے' یہ قوانین فطرت عالمگیر' لازمی اور ابدی ہیں۔ اسی طرح دینی قوانین یا احکام کا تعلق بھی انسان کی اس زندگی سے ہے جو وہ اس ٹھوس اور محسوس دنیا میں گزارتا ہے۔ دین اسلام کو دین فطرت کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس دین کا اتباع کرنے والوں کی زندگیوں کے نصب العین کا تعلق اس دنیا سے ہے' اور اس نصب العین کا حصول بھی اسی دنیا میں ممکن ہے۔ یہ نصب العین زمینی ہے' فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن میں کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے خدائی احکام کی نافرمانی کی' تو ان کا حشر یا عاقبت اسی دنیا میں تھی۔ دوسرے الفاظ میں نافرمان قوموں کو اپنی نافرمانیوں کا نتیجہ اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے' اور ان کی عاقبت بھی اسی دنیا میں بنتی ہے۔ دوسرے' اسلامی قوانین بھی' قوانین فطرت کی طرح عالمگیر' لازمی اور ابدی ہیں۔ کائنات فطرت اور وہ خدا ساز فطرت جو دین اسلام ہے' ان دونوں میں مماثلت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کائنات فطرت جسے قرآن حکیم نے ایک حقیقت قرار دیا ہے' اس پر غور و فکر کرنے سے بھی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے قوانین اور ہدایات مل

سکتیں ہیں۔ اگر اقبال کے اس نظریے کو سامنے رکھا جائے کہ کائنات فطرت' ذات الہیہ کی سیرت و کردار ہے تو اس سیرت و کردار کے مطالعے سے ان اصولوں اور ضابطوں کا پتہ چلے گا جن پر ذات الہیہ سرگرم عمل ہے۔ اگر دین اسلام کا اتباع یہ ہے کہ انسان اللہ کے دیے ہوئے قواعد و ضوابط پر عمل کرے تو یہ قواعد و ضوابط ان قوانین سے کیسے مختلف ہو سکتے ہیں جن کے تحت خدائی سیرت و کردار کا اظہار عالم فطرت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ قوانین جن پر دین اسلام مشتمل ہے' اگر ایک طرف قرآن حکیم میں موجود ہیں تو دوسری طرف ان کا علم صحیفہ فطرت کے مطالعے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس قرآنی آیت کی رو سے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان میں اپنی روح پھونک دی' انسانی کردار کی روح وہی ہونی چاہیے جو اللہ کے کردار کی ہے۔

اب میں آیت کے اس حصے کی طرف آتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ جس فطرت کا اتباع لازمی ہے' وہ اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کسی شے کی فطرت سے مراد وہ سب کچھ ہوتا ہے جس پر اس شے کے وجود کا انحصار ہے۔ اس طرح وہ فطرت جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے' ان قوانین یا قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے جن کے تحت انسانی زندگی کا وجود قائم ہے۔ ایسی فطرت کا دین اسلام کے مترادف ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ دین اسلام ان قوانین پر مشتمل ہے جن کے تحت ہی انسانی زندگی کو بقائے دوام مل سکتی ہے' جن کو نظر انداز کر کے ہی یا جن سے ہٹ کر ہی انسانی زندگی کو فنا اور موت ہے۔ انسان اس طرح پیدا کیا گیا ہے یا اس کی فطرت اس نوع کی ہے کہ اسے اپنی زندگی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اور ارتقائی منازل کو کامیابی سے طے کرنے کے لیے ان قوانین پر لازماً عمل کرنا پڑے گا جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ اس کائنات فطرت میں ہر شے جس کا چلن اور ڈھنگ قوانین فطرت کے تحت متعین کیا گیا ہے' اس وقت تک باقی یا زندہ ہے جب تک وہ ان قوانین کے تابع ہے۔ اگر قوانین فطرت ختم ہو جائیں یا کارفرما نہ رہیں تو لازم ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء نیست و نابود ہو جائیں کیونکہ ان کی ہستی اور وجود کا انحصار ان قوانین کے تابع رہنے ہی پر ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان کی اس فطرت کی' جس پر اسے تخلیق کیا گیا ہے' دو سطحیں ہیں' ایک ادنیٰ اور دوسری اعلیٰ۔ ادنیٰ سطح وہ ہے جس پر انسان محض تحفظ ذات اور افزائش نسل کی خاطر ان جبلی خواہشات کی تشفی کرتا ہے جو کھانے' پینے' سونے اور جنس سے متعلق ہیں۔ اس سطح کے افعال

اس کی ادنیٰ فطرت میں داخل ہیں۔ یہ اس کے فطری تقاضے ہیں جن کو پورا کر کے وہ محض زندہ رہتا ہے اور نسل بڑھاتا ہے۔ یہ سطح انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔ لیکن انسانی زندگی جبلی خواہشات کی ادنیٰ فطرت تک ہی محدود نہیں۔ فطرت کی ادنیٰ سطح سے آگے بڑھ کر، لیکن اسی فطرت کی اساس پر انسانی فطرت کی اعلیٰ سطح وضع ہوتی ہے جس میں تحفظ ذات اور افزائش نسل کے ساتھ ساتھ اس کی حیات اجتماعیہ تشکیل پاتی ہے۔ ایسی حیات جو نہ صرف اجتماعی طور پر منظم و منضبط اور محفوظ و پرامن ہوتی ہے، بلکہ جو انفرادی طور پر فرد کی تکمیل ذات یا اقبال کے الفاظ میں اس کی خودی کے استحکام کی ضامن بھی ہوتی ہے۔ پس جس طرح انسانی فطرت کی ادنیٰ سطح اس کی جسمانی خواہشات کی تشفی پر مشتمل ہے، اسی طرح اس کی اعلیٰ سطح اس کی اجتماعی زندگی کو منظم و منضبط کرنے، اسے محفوظ اور پرامن بنانے اور اسے قائم و دائم رکھنے پر مشتمل ہے۔ تو ایسے قوانین جن کے تحت انسان اپنی اجتماعی زندگی کو نہ صرف ممکن بناتا ہے، بلکہ اسے ترقی و فروغ دیتا ہے، قوانین فطرت ہیں۔ انہی قوانین پر اس کی اجتماعی زندگی کا انحصار ہے اور یہی قوانین، قوانین اسلام ہیں۔ ان قوانین سے انسان کو کسی حالت میں بھی مفر نہیں، اسی طرح جیسے کھانے پینے وغیرہ سے، جن پر اس کی جسمانی زندگی کا انحصار ہے، اور جن کو نظرانداز کر کے وہ ہلاکت کا سامنا کرتا ہے، مفر نہیں۔ ان قوانین کے بغیر حیات اجتماعیہ ممکن نہیں اور انہی قوانین کا اتباع اس کی اعلیٰ فطرت میں داخل ہے۔ انہی معنوں میں اسلام دین فطرت ہے اور اس کے قوانین کی نوعیت ویسی ہی سائنسی ہے جیسی خارجی کائنات فطرت کے قوانین کی۔

مذکورہ بالا تصریحات، جن سے میں نے اس امر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم کن معنوں میں دین اسلام کو دین فطرت اور اس کے قوانین کو قوانین فطرت کہہ سکتے ہیں، کی روشنی میں مجھے وہ نظریہ پیش کرنے میں کوئی مشکل نہیں جس کی رو سے اسلام کے بعد نبوت ختم ہونے پر بھی وحی محمدیؐ کے اتباع کا جواز رہتا ہے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی روح سائنسی ہے جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ہے، یعنی ہر پیغام ان قوانین پر مشتمل ہے جو اس طرح کے سائنسی قوانین ہیں جیسے کہ قوانین فطرت، تو اب اس پیغام کو اس لیے قبول کیا جائے گا، اور اس پر اس لیے عمل ہو گا کہ یہ پیغام ایک سائنسی نظام کا حامل ہے۔ یہ بھی دوسرے علوم کی طرح کا ایک علم ہے۔ اس پر اب عمل اس لیے نہیں ہو گا کہ اس پیغام کا مبداء کوئی فوق الفطرت ذات ہے (اگرچہ کوئی شخص چاہے تو از روئے ایمان ایسا کر سکتا ہے) بلکہ

اس لیے ہو گا کہ جن قوانین پر یہ مشتمل ہے' وہ قوانین ہیں جن پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے' جن پر اس کی فطرت وضع ہوئی ہے۔ دین اسلام کے احکام ایسے نہیں جن کو بقول اقبال ایک مطلق العنان حکومت نے نافذ کر دیا ہے اور جن پر ہم محض کسی خوف کے تحت عمل کرتے ہیں' بلکہ ان پر ہم اس لیے عمل کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ ہماری اپنی ہی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اس طرح اقبال کے اس خیال کا مفہوم بھی صاف ہو جاتا ہے کہ یہ قوانین انسانی زندگی کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ استقرائی عقل کے ظہور سے جن نئے علوم کی تدوین و ترقی ہوئی ہے' ان میں سے ایک علم دین اسلام کا علم ہے۔ اسلام میں نبوت کے' معراج کمال کو پہنچنے پر' ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی اپنی ارتقائی منازل طے کر کے' اسلام میں' اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں اب یہ محض وحی نہیں رہی' بلکہ ایک علم کا درجہ بھی حاصل کر گئی ہے ۔ اب اس علم کے ہوتے ہوئے کسی اور وحی و الہام کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ جو شعور حیات انسان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے درکار تھا' وہ اسے اس علم کی شکل میں مل گیا ہے؟ نہیں! وہ ان قوانین کی شکل میں ملا جو قوانین فطرت کے مانند عالمگیر' لازمی اور ابدی ہیں۔

میں نے جو یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ وحی محمدیؐ ایک علم ہے' اور ایک سائنسی نظام کی حامل ہے تو آپ اس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ کیا میرے پاس اس کی کوئی قابل قبول سند ہے یا یہ محض میرے اپنے ذہن کی اختراع ہے' تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے کسی انوکھے خیال کا اظہار نہیں کیا' اس تصور کی تصدیق قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے:۔

۱۔ "اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔ (ان سے) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے' اور اے پیغمبر! اگر تم اپنے پاس علم (یعنی وحی خدا) کے آ جانے پر بھی ان کی خواہشوں پر چلو گے تو تم کو (عذاب) خدا سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہو گا نہ کوئی مددگار۔" (۲-۱۲۰)

۲۔ "اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو' عربی زبان کا فرمان' نازل کیا ہے۔ اور اگر تم علم (و دانش) آنے کے بعد ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو خدا کے سامنے نہ کوئی تمہارا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔" (۱۳-۳۷)

۳۔ "اور یہ بھی غرض ہے کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے' وہ جان لیں کہ وہ (یعنی وحی) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے' تو وہ اس پر ایمان لائیں اور ان کے دل خدا کے آگے

عاجزی کریں۔" (عربی زبان میں علم کے معنی ہیں سائنسی علم' اور قرآن حکیم کی رو سے بھی علم وہ شے ہے جس کو آنکھ نے دیکھا ہو' کان نے سنا ہو اور فواد (قلب) نے اس کے دھوکا نہ ہونے کی گواہی دی ہو)۔ "اور (اے بندے) جس جس چیز کا تجھے علم نہیں' اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل' ان سب سے ضرور باز پرس ہو گی۔" (۱۷-۳۶)

۴۔ اور لفظ 'قلب' قرآن حکیم میں ذہن کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "ان کے دل ہیں' لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔" (۷-۱۷۹)

○

حوالہ جات

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' مترجمہ سید نذیر نیازی ص ۱۹۱
۲۔ ایضاً ص ۱۹۰
۳۔ ایضاً ص ۱۹۳
۴۔ ایضاً ص ۱۹۳
۵۔ ایضاً ص ۱۹۳
۶۔ ایضاً ص ۱۹۴
۷۔ ایضاً ص ۱۹۵
۸۔ ایضاً ص ۱۹۵
۹۔ ایضاً ص ۱۹۵
۱۰۔ ایضاً ص ۹۵
۱۱۔ اقبال اور قادیانی' مرتبہ نعیم آسی ص ۸۵
۱۲۔ ایضاً ص ۸۶
۱۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' مترجمہ سید نذیر نیازی ص ۳۰۶
۱۴۔ اقبال اور قادیانی' مرتبہ نعیم آسی ص ۸۴
۱۵۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' مترجمہ سید نذیر نیازی ص ۱۹۳